کتابوں پر تبصرے

۱- "پرتوِ تحقیق"

مصنفہ : ڈاکٹر آصفہ زمانی

تبصرہ نگار: نجم الاسلام

فارسی زبان و ادب سے متعلق تحقیقی و تنقیدی مقالات کا ایک قابلِ مطالعہ مجموعہ "پرتوِ تحقیق" کے موزوں نام سے کچھ عرصہ پہلے کتابی صورت میں سامنے آیا ہے، جس کی مصنفہ شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی کی خاتون استاد ڈاکٹر آصفہ زمانی لکھنوی ہیں۔ اس کا ایک نسخہ جامعۂ سندھ کے فاضل مکرم ڈاکٹر احمد اقبال لکھنوی نے عنایت فرمایا ہے، اور اظہارِ خیال کی دعوت دی ہے۔ چنانچہ تعارف و تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

"پرتوِ تحقیق" میں دس مقالے شامل ہیں۔ ان میں ایک کے سوا باقی نو مقالے فارسی زبان و ادب سے متعلق کانفرنسوں اور سمیناروں میں پیش کیے گئے ہیں۔ جن کا انعقاد ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۵ء کے مابین دھلی، پٹنہ، لکھنؤ، علی گڑھ، احمد آباد اور بمبئی میں عمل میں آیا تھا۔ مصنفہ کو طالب آملی کے دیوان غزلیات کی تدوین پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی تھی اور اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ جیسا کہ "پرتوِ تحقیق" میں شامل مقالات سے ظاہر ہے، ڈاکٹریٹ کے بعد بھی موصوفہ کی تحقیقی و تنقیدی سرگرمیوں کی رفتار خاصی رہی ہے، اور ان کے کام کو سراہا بھی گیا ہے۔ چنانچہ "تقریظ" میں ڈاکٹر ولی الحق انصاری کی یہ رائے ملتی ہے

کہ "(ڈاکٹر آصف زمانی) اگرچہ فارسی کے تدریسی میدان میں نسبتہً نووارد ہیں لیکن تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے علمی و تحقیقی میدان میں اپنے لیے جگہ بنالی ہے"۔ ڈاکٹر ولی الحق انصاری لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے پروفیسر اور صدر ہیں۔ ان کے کلماتِ تحسین، جو بلا شبہ ایک توازن اور اعتدال کے ساتھ ہیں، نوجوان محقق کے حق میں تو حوصلہ افزا ہیں ہی، اس کے ساتھ برصغیر کی دانش گاہوں میں فارسی تحقیق کی روایت کا تسلسل قائم و باقی رہنے کی توقعات بھی بندھاتے ہیں۔

اب ہم مصنفہ کے "پیش گفتار" کی طرف آتے ہیں جس میں وہ فارسی زبان کی شیرینی اور اس کے شعر و ادب کی سحر انگیزی کا ذکر کرتی ہیں اور اس زبان سے اپنے شغف کا اظہار کرنے کے بعد اپنے مضامین و مقالات کا اجمالی تعارف بھی کراتی ہیں۔ اس نکتہ بہ نکتہ تعارف سے بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ زیرِ مطالعہ موضوعات پر عمدگی سے سوچا گیا ہے اور انھیں حتی الامکان نتیجہ خیز بنایا گیا ہے، جیسا کہ آگے چل کر بعض مقالات کے تعارف میں ہم کسی قدر تفصیل سے مصنفہ کے دلائل و نکات کا احاطہ کریں گے۔ آخر میں وہ رقم فرماتی ہیں کہ "اس محققانہ پرتو کی تابش نے دنیائے تحقیق کے کن گوشوں کو منوّر کیا ہے یہ فیصلہ روشن بین صاحب نظراں سے وابستہ ہے"۔

مجموعے کا پہلا مقالہ "غالب اور طالب" خاصا فکر انگیز ہے اور ایک دل چسپ تقابلی مطالعہ پیش کرتا ہے۔ مصنفہ کا کہنا یہ ہے کہ بیدل کے رنگ کو ترک کرنے کے بعد غالب نے ابتدائی مغل دور کے شعراء عرفی، نظیری اور طالب کی پیروی کو پسند

کیا (ص۱۹)۔ وہ صراحت کرتی ھیں کہ ان شعراء کے ساتھ موازنہ کرنے سے غالب کی اعلیٰ درجے کی استعداد نمایاں ھوجائے گی (ص ۲۰)۔ موازنے کے لحاظ سے، ان کے نزدیک، طالب کو عرفی پر ترجیح ھے کیوں کہ "اگرچہ عرفی کا نام طالب سے پہلے آتا ھے لیکن اس کے یہاں وہ وارفتگی اور وہ والہانہ پن نہیں جو غزل کی جان ھے، اس کے یہاں تناؤ ھے، اس کے یہاں علمیت کی ایک انا ھے، اس کی خودداری قدم قدم پر رکاوٹ بن گئی ھے" (ص ۲۱)۔ جبکہ طالب کے ساتھ موازنے کی متعدد وجوہ ھیں مثلاً دونوں پندار کے شاعر ھیں (ص ۲۲)، دونوں نے معاملاتِ حسن و عشق کا بےمحابا بیان کیا ھے (ص ۲۳)، دونوں نے فلسفیانہ مسائل اور اخلاق و تصوف پر ژرف نگاھی کا ثبوت دیا ھے گو کہ فیشن کے طور پر ایسا کیا ھے (ص ۳۰)۔ اشتراک میں کچھ پہلو اختلاف کے بھی ھیں جن سے دونوں کی انفرادیت نمایاں ھے، اور غالب کی برتری بھی۔ اس نکتے کو عمدہ طور پر اشعار سے مزین کرکے پھیلایا ھے۔ وہ بتاتی ھیں کہ دونوں کی عشقیہ شاعری کے مختلف رنگ ھیں، طالب کو اپنے ماحول سے خاطرخواہ آسودگی حاصل ھے، وہ ایک چھکا ھوا شاعر ھے، برخلاف اس کے غالب کا ماحول بکھرتا ھوا شیرازہ اور نجی زندگی بھی کسی عذاب سے کم نہیں (ص ۲۷)۔ غالب کے کلام میں غضب کی الم ناکی ھے جو طالب کے یہاں مفقود ھے (ص ۲۸)۔ آتش یا آگ کا مضمون دونوں کے یہاں ھے لیکن دونوں کی آگ مختلف ھے، طالب کی آگ افسردہ اور بجھی بجھی سی ھے اور شاید مانگے کی ھے، برعکس اس کے غالب کی آگ کے شعلے بھڑکتے ھیں، خود اسے جلاتے ھیں اور پڑھنے والوں کے دلوں کو گرماتے ھیں (ص ۳۴)۔ طالب تشبیہ و استعارہ کا بادشاہ ھے، مگر غالب جدت کے ساتھ تشبیہیں لاتے ھیں (ص ۳۷)۔

علیٰ ہذا ہم طرح غزلوں کے تقابلی مطالعے سے بھی وہ دونوں شاعروں کے کمالاتِ شعری کا فرق ظاہر کرنے میں کامیاب ہیں۔ ایک ہی زمین اور قافیے کی قید کے ساتھ طالب تو بادشاہوں کی مزاجی کیفیت سناتا ہے اور غالب دردِ محبت کا بیان کرتا ہے۔ وہ خیال ظاہر کرتی ہیں کہ بوی گل اور روی گل والی ہم طرح غزلوں کا موازنہ کیجیے تو غالب نے طالب سے کہیں بہتر غزل کہی ہے (ص ۴۲)، اور یہ کہ اس میں دو رائیں نہیں کہ غالب کی شاعری ایران کے باکمال اساتذہ کی شاعری کی بلندیوں تک جا پہنچی ہے (ص ۴۳، ۴۴)۔ آخر میں وہ افسوس کا اظہار کرتی ہیں کہ ایران کے نقادوں اور دانش وروں نے غالب کے شعری کمال کو سمجھنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔

مجموعے کا دوسرا مقالہ "سعدی، خسرو اور حافظ غزل کے آئینے میں" بھی ایک دل چسپ اور فکر انگیز مقالہ ہے۔ وہ عمدہ استدلال کے ساتھ فارسی غزل میں خسرو کو سعدی اور حافظ کی درمیانی کڑی اور اسے کلیدی حیثیت کا حامل قرار دیتی ہیں۔ "فارسی غزل کی بتدریج ترقی پر نظر ڈالنی ہو تو فارسی زبان و ادب کے تین عظیم فنکار سعدی، خسرو اور حافظ کا مطالعہ کافی ہے" (ص ۴۵)۔ اور یہ کہ "جس نقشے کو سعدی نے تیار کیا تھا اسے عمارت کی شکل تو خسرو ہی نے دی، زیبائش و آرائش کا کام باقی تھا سو حافظ کی چابکدستی نے انجام دیا" (ص ۷۲)۔ یہ مقالے کا ماحصل ہے مگر اس نتیجے پر پہنچنے اور پہنچانے سے پہلے سعدی، خسرو اور حافظ کی غزلوں کے تجزیے سے ان کے مختصات کو بخوبی واضح کیا گیا ہے۔

تیسرا مقالہ ایک چونکانے والے موضوع پر ہے یعنی بیدل کی سہل نگاری، جبکہ بیدل کو بالعموم پیچیدہ بیانی کا مظہر اور

دقت پسندی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ بیدل کا اپنا ایک طرز اور شاعری میں ایک مقام ہے۔ مقالے میں بہت سی کوشش اور محنت بیدل کی تفہیم یا خصوصیاتِ شعری کی نشان دھی پر صرف کی گئی ہے مگر مقالے کا اصل مسئلہ تو کچھ اور ہے۔ مصنفہ توجہ دلاتی ہیں کہ غالب کو غالب ان کی سہل نگاری نے بنایا نہ کہ مشکل پسندی نے، بیدل کو بھی قبولِ عام کی خلعت عطا کرنے کے لیے ان کی سہل نگاری کی طرف نظر کرنا نہایت ضروری ہے۔ وہ استدلال کرتی ہیں کہ "بیدل کے بعض اشعار زبان زد ہوگئے ہیں۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ کسی شاعر کے وہی شعر زبان زدِ خاص و عام ہوتے ہیں جو سہل، آسان اور رواں ہوتے ہیں۔ بیدل کے اس قسم کے اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ بیدل صرف دقت پسند اور مشکل گو شاعر نہیں بلکہ آسان پسند اور سہل نگار بھی ہے۔ اگرچہ عوامی شاعر نہیں ہے، پھر بھی وہ جب تک اپنی مشکل پسندی کے خول سے باہر نہیں آئے لوگوں نے قبولِ عام کی سند نہیں دی۔ بیدل کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہے۔ آج تک لوگوں نے اسے مشکل پسند کی حیثیت سے جانا ہے۔ اگر آنے والی نسلیں جستجو و تلاش سے کام لیں تو بیدل کے دل کی دھڑکنیں بھی عام انسانوں کے دلوں میں سنی جاسکتی ہیں"(ص ۸۷)۔ اس پرلطف Hypothesis کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری تھا کہ متوازی طور پر بیدل کے آسان پسند اور سہل‌نگار بھی ہونے کے، یا جیسا کہ غالب کے ساتھ پیش آیا، بعد کو بن جانے کے کافی شواھد پیش کیے جاتے۔ لیکن مصنفہ نے اپنے اس مقالے کے آخری حصے میں محض چند ضرب‌المثل اشعار پیش کردینے کے سوا کوئی قابلِ ذکر پیش رفت اس جہت میں نہیں کی ہے۔ اور کہا ہے تو یہ کہ آنے

والی نسلیں تلاش و جستجو سے کام لیں۔ واضح رہے کہ غالب اپنی مشکل پسندی کے خول سے باہر نکل آئے تھے، اس لیے ان کے ہاں سہل نگاری کے معتدبہ نمونے ملتے ہیں۔ جو مشکل پسند شاعر فی‌الجملہ سہل نگاری کی طرف ارادۃً آیا ہی نہ ہو، پھر آنے والی نسلوں کو بھی اس کے سہل کلام کی بازیافت میں کامیابی معلوم۔ اس کے چند سہل اشعار یہ تو ظاہر کرتے ہیں کہ شاعر سہل گوئی پر قادر تھا لیکن یہ تو ثابت نہیں کہ وہ سہل پسند یا سہل نگار تھا یا رہا تھا، جیسا کہ مقالے میں نتیجہ نکالا گیا ہے اور جس کی بنا پر آنے والے زمانے میں سہل کلام کی تلاش و جستجو میں کامیابی کا خیال ظاہر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد جو تین مقالے درج ہیں ان کے موضوعات یہ ہیں: "شمس العلماء مفتی میر عباس (لکھنوی، وفات ۱۳۰۶ھ) بحیثیت فارسی شاعر"، "طالب آملی بحیثیت رباعی گو" اور "مثنوی سحرِ حلال (اهلی شیرازی وفات ۹۴۲ھ) اور مثنوی یدبیضا (خواجہ عزیز لکھنوی ولادت ۱۸۲۱ء) پر ایک طائرانہ نظر"۔ اب ہم ساتویں مقالے کی طرف آتے ہیں جس میں حسین قلی خاں عاشقی کے تذکرہ نشترِ عشق کو متعارف کرایا گیا ہے۔ فارسی شعراء کے اس تذکرے کا جو قلمی نسخہ مصنف کے پیشِ نظر رہا ہے اور جس کے مختصات کو عمدہ طور پر پیش کیا گیا ہے وہ کتاب خانہ سلطان المدارس لکھنؤ کا نسخہ ہے۔ فارسی تذکرہ نویسی سے متعلق چند مختصر کلمات کی تمہید کے بعد تذکرہ نگار کے احوال کا بیان ہے، اس کی فارسی شاعری کا تعارف ہے اور ان تذکروں اور دیگر ماخذوں کی نشاندہی ہے جن میں تذکرہ نگار (عاشقی) کے حالات، کم یا بیش، مذکور ہیں۔ اس کے بعد تذکرہ نشترِ عشق سے متعلق بحثیں آتی ہیں۔ سببِ تالیف، اس کا

عرصۂ تالیف (۱۲۲۴ ھ تا ۱۲۳۳ ھ)، اس کے دیگر قلمی نسخے کہاں کہاں دستیاب ہیں (بانکی پور پٹنہ، رام پور، لاہور)، تعداد شعراء، اندراجِ حالات کی کیفیت، ماخذات (۳۲ کتابیں)، سلطان المدارس والے نسخے کی خصوصیات (خوبیاں اور خامیاں) و اسلوبِ تحریر (پرتکلف اور مصنوعی)، لسانی اغلاط (جن سے مولفِ تذکرہ کا عربی سے نابلد ہونا ظاہر ہوتا ہے)، خاتمہ — غرض کہ دقتِ نظر کے ساتھ تذکرے کا جائزہ لیا ہے اور اسکی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مجموعے کا ایک اچھا اور معلومات افزا مقالہ ہے۔

آٹھویں مقالے کا عنوان "حافظ شیرازی بحیثیت قصیدہ سرا" اور نویں مقالے کا عنوان "طالب آملی کے عشقیہ کلام کی چند جھلکیاں" ہیں۔ یہ بھی مطالعے کا اچھا مواد پیش کرتے ہیں۔ اور طالب پر تو مصنفہ کو اختصاص حاصل ہے۔ چنانچہ اس مختصر مقالے سے بھی کلامِ طالب کی بہتر تفہیم میں مدد ملتی ہے۔

مجموعے کا ایک نہایت دلچسپ اور قابلِ مطالعہ مقالہ "میر تقی میر کے منظوم و منثور فارسی آثار، ایک تنقیدی جائزہ" ہے جو دسواں اور آخری مقالہ ہے۔ اس میں میر کے فارسی شعری کلام اور فارسی نثر کو تحقیق و تنقید کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس بات کا تعین کرنے کے لیے کہ فارسی ادب میں میر کا کیا مقام بنتا ہے؟ مصنفہ نے سب سے پہلے میر کے فارسی دیوان کو موضوعِ تحقیق بنایا ہے۔ کلام کس قدر ہے؟ ابتدا کب ہوئی؟ معاصر تذکروں میں کن خیالات کا اظہار میر کی فارسی شاعری کے بارے میں کیا گیا ہے؟ ہمارے نقاد اور ادبی مؤرخ کیا کہتے ہیں؟ ان نکات کو روشنی میں لانے کے بعد وہ ایک ادبی مؤرخ کے اس خیال کی تردید کرتی ہیں کہ میر رواجِ زمانہ

کے مطابق معاشرے کی نظر میں اپنا رتبہ بڑھانے کے خیال سے فارسی کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ وہ کہتی ہیں کہ جس شخص کا مرتبہ اردو میں 'حافظِ شیراز' کی برابری کر رہا ہو، جس کی قبولیتِ عام کا یہ عالم ہو کہ لوگ اس کے اشعار تبرکاً لے جاتے ہوں اسے مزید مرتبہ بڑھانے کی کیا ضرورت؟ (ص ۲۰۱)۔ علیٰ ہذا وہ بعض نقادوں کے خیال کو بھی رد کرتی ہیں کہ میر کی فارسی شاعری ان کی اردو شاعری کا چربہ ہے اور بس۔ وہ صراحت کرتی ہیں کہ میر کی بیس پچیس غزلوں یا سو سوا سو اشعار سے، جو اردو سے کسی صورت مشابہت رکھتے ہوں، ان کے تین ہزار سے زائد ابیات پر حتمی طور سے یہ لیبل چسپاں کرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔ (ص ۲۰۱)۔ ان تصریحات کے بعد وہ میر کی فارسی غزلیات، رباعیات، مثنوی اور ترجیع بند کی تحسین کرتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ میر کی فارسی غزلیات قابل توجہ ضرور ہیں (ص ۲۱۱)۔ رباعیات البتہ اُن کی غزلیات کے پائے تک نہیں پہنچیں۔ (ص ۲۱۷)۔ مثنوی کی کہانی میں افسردگی تو ہے لیکن قنوطیت نہیں البتہ بلحاظ خصوصیاتِ شعری اس میں کوئی بات قابل ذکر نہیں۔ (ص ۲۱۹)۔ ترجیع بند میں بھی بلحاظ شعریت کوئی چیز قابلِ ذکر نہیں البتہ ایک ترکیب فارسی زبان کے قواعد کے خلاف استعمال کی ہے۔ (ص ۲۲۰)۔ اس تفصیلی جائزے کے بعد جو ان سب اصناف کو محیط ہے، جن میں میر کا فارسی کلام ملتا ہے، اب وہ میر کا جائزہ بحیثیت فارسی نثر نگار لیتی ہیں اور صراحت کرتی ہیں کہ نکات الشعراء اپنی ابتدائی شکل میں ۱۱۶۰ھ کے قریب یعنی جب میر کی عمر پچیس سال سے متجاوز نہ تھی ان کے نیم شوریدہ ذہن کی ناتمام تخلیق کی شکل میں سامنے آیا (ص ۲۲۱، ۲۲۲)۔ نکات الشعراء کے متعلق بعض تفصیلات پیش کرنے کے بعد وہ لکھتی ہیں کہ اس تذکرے

کی خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ اس وقت تحقیق کے کوئی اصول مقرر نہیں ہوئے تھے تاہم میر نے کوئی بات بغیر تحقیق کے نہیں لکھی ہے (ص ۲۲۵)۔ جن شعراء کا حال انہیں معلوم نہیں ہو سکا ہے انہوں نے اپنی لاعلمی کا صاف اعتراف کیا ہے (ص ۲۲۵)۔ یہ ضرور ہے کہ میر کا لہجہ اکثر جگہ تند ہے، لیکن یہ وہی مقامات ہیں جہاں رد و قدح ضروری ہے (ص ۲۶۶)۔ اپنے ذکر میں بے حد انکسار برتا ہے (ص ۲۲۶)۔ حالات و کلام کے انتخاب میں ذوقِ سلیم کا اظہار کیا ہے (ص ۲۲۶)۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر وہ "فیض میر" کا جائزہ لیتی ہیں۔ وہ "فیض میر" کی نثر پر اپنی رائے یوں ظاہر کرتی ہیں "میر چھوٹے لیکن مقفیٰ جملے لکھتے ہیں۔ "فیض میر" کا بھی یہی انداز ہے (ص ۲۳۰)۔ نثر فارسی میں مثنوی دریائے عشق کا قصہ بھی میر کی تصنیفات میں سے ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر آصفہ زمانی کی رائے ہے کہ "نثر میں مثنوی کا قصہ زبان و بیان کے اعتبار سے انشائے فارسی کا ایک معیاری نمونہ ضرور ہے لیکن باعتبار شدتِ بیان کم تاثیر اور احساسِ زود گذری کا حامل ہے (ص ۲۳۷)۔ آخر میں "ذکر میر" کا ذکر آتا ہے جس کے بارے میں مصنفہ کی صراحت ہے کہ یہ باضابطہ سوانح عمری نہیں ہے، وقتاً فوقتاً لکھی ہوئی یادداشتوں کو کتاب میں من و عن شامل کر دیا ہے (ص ۲۳۸)۔ یہ اس زمانے کے دھلی و لکھنؤ کی تاریخ بھی ہے (ص ۲۳۹)۔ ان سب نثری آثار کے مطالعے کے بعد وہ میر کے طرزِ نگارش کا سوال اٹھاتی ہیں۔ وہ صراحت کرتی ہیں کہ فارسی ادب میں مکتبِ خراسانی، مکتبِ عراقی، مکتبِ ہندی اور تحریکِ بازگشت — یہ چار اسٹائل خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں (ص ۲۴۰)۔ میر کی طرز نگارش "تحریکِ بازگشت" کی آواز ہے (ص ۲۴۲)۔

جس سے مراد یہ ہے کہ خراسان اور عراقِ عجم کے قدماء کے طرز کی تجدید کی جائے۔ وہ آسی کے اس قول کو پیش کرتی ہیں کہ "میر صاحب کی فارسی نثر بہت بہتر ہے . . . (لغزشوں کے باوجود) ان کی طرزِ خاص، روانی اور شگفتیٔ عبارت داد کے قابل ضرور ہے" (ص ۲۴۳)۔ اس لیے بجا طور پر مقالے کو اس جملے پر ختم کرتی ہیں کہ "میر جس جامعیت کا نام ہے اس کا تصوّر بلا شبہہ اس کے فارسی نظم و نثر کے آثار کے دقیق مطالعے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا (ص ۲۴۳)۔

کتاب بلا شبہہ دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔ اس کی اشاعت پر ہم مصنفہ کو مبارک‌باد پیش کرتے ہیں کہ وہی اس کی ناشر بھی ہیں۔ کتابت کی اغلاط متعدد رہ گئی ہیں جن کو درست کر لیا جاتا تو اچھا تھا۔ مصنفہ نے یا کاتب نے، جس کے حساب میں بھی شمار ہو، اکثر مقامات پر امالہ کیے بغیر، اس طرح لکھا ہے: اس سلسلہ میں . . .، چیلنج کے نتیجہ میں (ص ۱۳۱)، آئینہ کی حیرت . . . (ص ۸۱)۔

کہیں کہیں مخاطبت میں ناہمواری آگئی ہے چنانچہ ایک ہی پیراگراف کے مسلسل جملوں میں خواجہ عزیز کے لیے "آپ" بھی آتا ہے (آپ کے قصائد قآنی سے ٹکر لیتے ہیں) اور "ان" بھی (ان کی نظر بیشتر روحانی حقائق پر رہتی ہے) (ص ۱۳۰)۔

ایک جگہ آتا ہے کہ (خواجہ عزیز کے شعر میں) مہِ مصر کی ترکیب پاکر غالب پھڑک اٹھے اور بہت تعریف کی۔ فرمایا مہِ کنعان سنا ہے، "مہِ مصر" نئی ترکیب پیدا کی ہے (ص ۱۳۰)۔ غالب کے اس فقرے میں تعریف واضح نہیں، یہ تعریض بھی ہوسکتی ہے۔ اس حکایت کو بےحوالہ بیان کیا گیا ہے۔

مجمع النفائس کے اقتباس میں سہواً ایک جگہ یای وحدت کی جگہ کسرۂ اضافت آگیا ہے، یعنی دیوانِ مختصر (بجائے دیوانے مختصر) (ص ۱۹۸)۔

آج کل اخباری اردو میں بکثرت ناهی (بلا فصل) استعمال ہو رہا ہے، جبکہ از روئے قواعد بالفصل آنا چاہیے۔ کتاب میں ایک جگہ ناهی آتا ہے: "بیدل کا تصوف محض رسمی و تقلیدی نہیں ہے ناهی اس قسم کا انداز ہے جو متأخرین هندی صوفیا کا رہا ہے" (ص ۷۹)۔ مگر اسی کے بالمقابل درست (بالفصل) استعمال کی مثال بھی مل رہی ہے: "نہ یہاں الفاظ کا گورکھ دھندا ہی ہے نہ تخئیل کی بے پروا اڑان ہی" (ص ۷۸)۔

ایک حوالے میں انگریزی میں ایتھے کا نام آتا ہے جو سہوِ کتابت کا شکار ہوگیا ہے (ص ۱۲۱)۔ دو مقامات پر متعلق لفظ کے ساتھ فعل کی مطابقت میں ناهمواری رہ گئی ہے۔ جب کہ ایک جملہ ہے کہ:

"حیرت میں لذتِ نظارہ باقی نہیں رہتا" (ص ۸۰)۔ علیٰ هذا ایک اور جملہ ہے کہ "حجاباتِ نظر مانع ہے" (ص ۷۹)۔ لیکن ان تسامحات کی ذمے داری شاید کاتب پر آتی ہے۔ اور کتاب کی گوناگوں خوبیوں کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں۔

— —